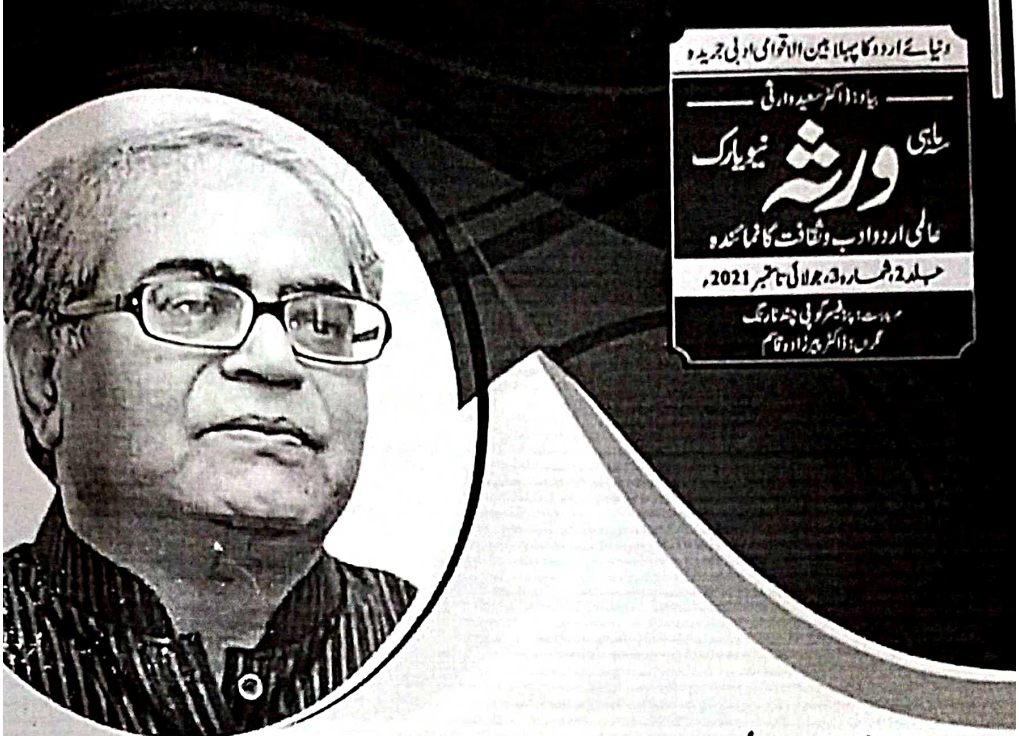

دنیائے اردو کا پہلا بین الاقوامی ادبی جریدہ
بیاد: ڈاکٹر سعید وارثی

سہ ماہی ورثہ نیویارک

عالمی اردو ادب و ثقافت کا نمائندہ

جلد 2، شمارہ 3، جولائی تا ستمبر 2021ء

سرپرست: پروفیسر گوپی چند نارنگ
نگراں: ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

مدیر اعلیٰ: رئیس وارثی
مدیر و ناشر: نصیر وارثی
Ph: 212-470-0660
1-800-675-1138
urdumarkazusa@gmail.com

ISBN: 978-1-63684-956-0

Shelly Stockton-Bruce, APRN earned her Bachelor of Science in Nursing from the University of Kentucky, as well as a Master of Science in Nursing from Western Kentucky University. Shelly is board certified by the American Academy of Nurse Practioners and is an Advanced Practice Registered Nurse by the Kentucky Board of Nursing.

Breathe Better.

Sleep Better.

It's Our Specialty

Now accepting new patients.

Dr. Mateen Ahmed is board certified in Critical Care Medicine, Pulmonary Medicine, Internal Medicine, and Sleep Disorder Medicine. He had his residency and fellowship training at St. Luke's Roosevelt Hospital in New York and the University of Chicago. He is a graduate of the Dow University of Health Science, Karachi. He is a Clinical Professor of Medicine-the University of Pikeville, Kentucky College of Osteopathic Medicine.

BREATHING DISORDERS:
COPD, Asthma, Pulmonary Fibrosis, Sarcoidosis, Coal workers pneumoconiosis, Asbestosis, Occupational

قائم چاند پوری کی حزنیہ تشکیلات کا جائزہ

ڈاکٹر منور حسین
(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)

میر وسودا کے دور کو صرف انھیں دونوں بزرگوں کی وجہ سے ہی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے بعد شاعروں کے دوسرے گروہ نے بھی اس عہد کی تشکیل وتزئین میں پورا پورا حصہ لیا ہے اور انھیں دوسرے گروہ کے شاعروں میں قیام الدین قائم چاند پوری کا بھی شمار ہوتا ہے جن کے اندر کسی عہد کی ادبی قیادت کا بار اٹھانے کی صلاحیت موجود تھی۔ قائم چاند پوری کا شمار اٹھارہویں صدی کے معتبر ترین شعرا میں ہوتا ہے جن کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ پیش رو، معاصر اور مابعد کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے قائم چاند پوری کے شاعرانہ کمال اور عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ کم گوئی کے باوجود انھوں نے شاعری کی تمام لفظی اور معنوی خوبیوں کو اپنے دیوان میں جمع کر دیا ہے۔ قائم چاند پوری اپنے عہد کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کا مطالعہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے سودا کے ذکر کے ذیل میں حاشیے میں ایک بے حد مختصر نوٹ میں لکھتے ہیں کہ

> ''یہ صاحب کمال چاند پور کے رہنے والے تھے مگر فن شعر میں کامل تھے۔ ان کا دیوان ہرگز میر وسودا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے مگر کیا کیجیے کہ قبول عام اور کچھ شی ہے، شہرت نہ پائی'' (آب حیات، ص ۱۵۶)

ڈاکٹر جمیل جالبی قائم چاند پوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قائم اس دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ تاریخ ادب میں ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس پر میر وسودا چھا جاتے ہیں اور جن کے سامنے ان سے کم درجے کے کسی شاعر کا چراغ جل نہ سکا۔ خواجہ میر درد اگر فقر وتصوف کو شاعری کا موضوع بنا کر اپنی انفرادیت قائم نہ کرتے تو اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود ان کی حیثیت بھی قائم کی سی ہو کر رہ جاتی۔ قائم سودا کی طرح کے شاعر ہیں لیکن سودا نہیں، قائم میر کی طرح کے شاعر ہیں لیکن میر نہیں'' (تاریخ ادب اردو، ج ۲، حصہ دوم، ص ۷۶۴)۔

جیسا کہ آزاد کے بیان میں یہ اشارہ موجود ہے کہ قائم کے یہاں میر وسودا دونوں کا رنگ موجود ہے لیکن قائم کا اپنا رنگ کیا ہے، اس کے بارے میں کچھ کہنا خاصا مشکل ہے لیکن ان کی شاعری میں میر کی پیروی کی بدولت یا ذاتی میلان کے باعث غم والم کا بیان خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے میر وسودا اور میر درد کے بعد ان کے کلام کا ایک اجمالی جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قائم کے کلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگرچہ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ پرگو شاعر نہیں ہیں۔ ان کا کلام خواجہ میر درد سے یقیناً زیادہ ہے لیکن میر وسودا کے مقابلے میں بہت کم مقدار ہے۔ میر درد کی طرح ان کے دیوان غزلیات کو بھی انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ قائم کی خوبی یہ ہے کہ ان میں میر اور سودا دونوں کے رنگ کی
کامیاب تقلید کی صلاحیت موجود تھی۔ میر ... اس عہد کا رنگ سخن تمام
کرنا قائم کی مجبوری بھی تھی اور ادبی اعتبار سے یہی روح عصر سب کے ہاں
رنگ میں ظاہر ہو رہی تھی۔ قائم کو غزل کے مزاج سے فطری مناسبت تھی، وہ
مسلمہ موضوعات کو کامیابی اور مہارت فن کے ساتھ بیان کرنے پر قادر تھے
میں ایک طرف سودا کی سی نشاط پسندی اور مزاج کی رنگینی تھی تو دوسری طرف
المیہ طرز بیان کے بھی کامیاب مقلد قرار دیے جا سکتے تھے۔ اس اعتبار سے
سخن امتزاجی تھا، ان کے یہاں بیان غم میں بھی ایک خاص طرح کی شوخی او
موجود ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ المیہ طرز احساس کی جمالیاتی تشکیل میں
کامیاب رہے ہیں۔

قائم کی طبیعت معنی آفرین تھی اور وہ زندگی کے تجربوں کی شعری تشکیل آسانی
کر سکتے تھے لیکن وہ طبعی طور پر بیرونی دنیا کی طرف مائل تھے۔ باطنی
ان کے یہاں زیادہ گہرائی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے وہ دہلی اور لکھنؤ کے
اتصال قرار دیے جا سکتے ہیں یعنی ان کے یہاں دہلی کی داخلیت اور لکھنؤ کی
ایک خاص تناسب کے ساتھ موجود ہے لیکن داخلیت کے مقابلے میں خارجی
زیادہ شوخ ہے۔ اس لیے غم کے جذبے کا بیان ان کی شاعری میں زیادہ تر
اور تمثال آفرینی کی صورت ملتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار سے اس حقیقت
اندازہ ہوتا ہے:

نہ دل بھرا ہے نہ اب دم رہا ہے آنکھوں میں
وہ محو ہوں کہ مثال حباب آئینہ
جوں لالہ داغ سینے سے کیا کام تھا ہمیں
کبھی جو روئے تھے خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں
یا رب ہرا ہو اس دل درخوں تشنہ کا

شاعری کے المیہ پہلوؤں کے اعتبار سے قائم کے یہاں یاس وناامیدی اور
آرزو کی ایک عمومی کیفیت موجود ہے۔ اس یاس وقنوط کا سبب اگر ایک طر
ناکامیاں اور محرومیاں ہیں تو دوسری طرف زمانے کی ناقدر شناسیاں اور نا
ہیں۔ اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی ناقدری کا احساس قائم کے المیہ عنصر کی ایک
اہم اساس ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

قائم میں عندلیب خوش آہنگ تھا ولے
یہ کیا ستم کہ طلب مدعا کی دی ہم کو
طلب کمال کی کوئی نہ کیجیو زنہار
زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے
جو کام دل ہی فلک حسب مدعا نہ دیا
کہ میں سیر کرکے فضول بہت زیاں دیکھا

قائم میں ایک قدرتی صلاحیت یہ بھی ہے کہ وہ طربیہ کے پس منظر میں المیہ کی
بھی دیکھا جا سکتا ہے:

نہ دیکھ سرسری اوراق گل کہ یاں قائم
ہے شرح تنگی غنچہ فراغ میں گل کے

پھول کے فراغ میں غنچے کی دل تنگی کی تشریح پڑھ لینے کے لیے ایک خاص طرز احساس اور ایک خاص طرز کا مشاہدہ درکار ہے جو قائم کے تخلیقی ذہن کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے۔ زمانے کے تغیرات اور عدم استقلال کو اکثر شاعروں نے بیان کیا ہے۔ میر کا مشہور شعر ہے:

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

قائم نے بھی بے ثباتی عالم کے بیان کے لیے تبسم گل کے عمل کو استعمال کیا ہے۔ میر کے اختصار معجز نگار کے ساتھ نہ سہی تاہم میر جیسی ایمائیت کے ساتھ کہتے ہیں:

آہ اے مرغ چمن کچھ تو بھی واقف ہے کہ صبح
گل نے کیا پوچھا تھا ہنس کر باغباں نے کیا کہا

قائم کے یہاں غم اکثر گزرے ہوئے عمل کا ہے یا گزرے ہوئے عمل کا شاخسانہ ہے یعنی غم کی جڑیں کہیں ماضی میں ہیں جن کی موجودگی سے شاعر بے خبر تھا لیکن جن کی بالیدگی نے اسے اچانک حیران کر دیا۔ یاد ماضی قائم کے یہاں ایک اہم سرچشمہ الم ہے اس لیے اس کے غم کے رشتے زیادہ تر ماضی کے ساتھ یا حال کے لمحہ میں ماضی کے اسباب غم کے انکشاف کے ساتھ مربوط ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ جانے کون سی ساعت چمن سے بچھڑے تھے
آتش تو دی تھی خانہ دل کے تئیں میں آپ
برنگ غنچہ بہار اس چمن کی سنتے تھے
گل شگفتہ دیروزہ ہوں میں گلشن میں
اے ضبط گریہ روئیں گے کیونکہ نہ اب لہو
کہ آنکھ بھر کے نہ پھر سوئے گلستاں دیکھا
پر کیا خبر تھی یہ کہ بجھایا نہ جائے گا
پہ جونہی آنکھ کھلی موسم خزاں دیکھا
زیادہ باد خزاں سے ہے مجھ کو بیم صبا
کچھ ہو سکا نہ دیدہ خوں بار کا علاج

غم کی عمومی کیفیات کے بیان میں قائم کو میر کی سی سادگی اور پرکاری حاصل ہے لیکن خوش آہنگ اور بامعنی ترکیبیں ان کے احساس الم پر "نشاط الم" کی چھوٹ بھی ڈالتی ہیں جس سے قائم کا اپنا انفرادی رنگ و آہنگ وجود میں آتا ہے۔ چند مطلع نشاط الم کا ملاحظہ ہو جو اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے:

ہیں جو کوئی کہ نالہ نیوش شکست رنگ
ہیں نہ اک خوں سے مرے دیوار و در بھیگے ہوئے
خاک سا ڈھیر سر رہ ہوں میں
گر اشب آنکھ سے کچھ آب کچھ مژگاں سے خوں ٹپکا
سنتے ہیں گوش جاں سے خروش شکست رنگ
کوہ بھی مثل شفق ہیں تا کمر بھیگے ہوئے
قافلہ عمر سفر کر گیا
میں چاہا جس کو کچھ کم ہو وہی حد سے فزوں نکلا

قائم کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں زندگی کا تجربہ صورت پذیر ہوتا نہیں دکھائی دیتا ہے البتہ انھیں بعض مضامین نظم کو فنی مہارت کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت ضرور حاصل ہے۔ ایک ایسی فنی مہارت کے اپنے ظواہر میں کہیں میر سے اور کہیں سودا سے مشابہ ہے۔ اتنی بات ضرور مشابہت کا رشتہ سودا کے مقابلے میں میر سے زیادہ گہرا ہے اس لیے قائم کے ایک ایسا حزنیہ عنصر یقیناً موجود ہے جو اسے فوری طور پر میر کے قریب لے جا اس حزنیہ عنصر کا رشتہ یقیناً زندگی کے الم انگیز واقعات و حوادث کے ساتھ ہو اس لیے محض تقلید یا پیروی سے جذبے کی صداقت وجود میں نہیں آ سکتی۔ بہر کی شاعری کا حزنیہ عنصر زیادہ تر جس عمل اور استعارے کی صورت میں ظاہر ہو اشک افشانی اور خونچکانی کا عمل ہے جس میں میر تقی میر ایسے ایسے فنی مرقعے ہیں کہ شاید و باید! تاہم یہی وہ عمل غم ہے جس کے فنی اور محاکاتی بیان میں قائم زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق قائم کے اشعار کا ملاحظہ ہو:

آج کے رونے میں جی ڈوب چلا تھا لیکن
چہرے پہ اشک سرخ سے ہیں سو طراز خوں
اے گریہ دعا کر کہ شب غم بسر آوے
موقوف شغل گریہ مری چشم اگر کرے
شب گریہ کی وابستہ مری دل شکنی تھی
نالہ دل نے رکھا مجھ کو خبردار بہت
دیکھو رہے ہے گریہ کا یہ رنگ کب تلک
تا چند ہر اک اشک کی ست میں جگر آوے
اتنا رہے نہ پانی کہ لب کوئی تر کرے
جو بوند تھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی

قائم کے عشقیہ تجربے کے بارے میں جمیل جالبی کا خیال ہے کہ:

"قائم کے عشقیہ تجربات اور تخلیقی صلاحیت معمولی درجے کی نہیں۔ ان کے لہجے میں جو گھلاوٹ ہے وہ ویسی ہی ہے جیسی میر کی عشقیہ شاعری میں نظر آتی ہے لیکن میر اپنی اعلیٰ درجے کی غنائیت سے قائم کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں" (تاریخ ادب اردو، ج ۲، حصہ دوم، ص ۷۸۲)۔

قائم چاند پوری کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قائم کے عشقیہ تجربے میں سچائی ہے لیکن میر تقی میر کے عشقیہ تجربے کی سی پیچیدگی اور گہرائی نہیں ہے۔ قائم گریہ سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کے یہاں ہجر و وصال کی وہ کشاکش بھی نہیں جو میر کی مرزا غالب کی شاعری کو گہری انسانی معنویت عطا کرتی ہے۔ ایک قائم کی شاعری میں ضرور نمایاں ہے جو ان کی شاعری کو ایک

ہے۔اس مجرد کیفیت غم کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

دل ڈھونڈتا ہے سینے میں مرے ہوا بھی ہے
دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پر اس طرح
میں اسیر قفس ہوں کہ عمر بھر جس نے
صبر و طاقت کو روؤں یا دل کو
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہمان رہے
نہ سیر باغ کی نے روئے آشیاں دیکھا
لگ پڑی آگ، گھر میں تھا سو جلا

قائم کی جذباتی دنیا میں غم کا ایک بڑا سرچشمہ ''زمانہ'' اور اس کی ناہمواریاں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ قائم کی دنیائے غم میں محبت کے مقابلے میں ''زمانہ'' ایک بڑی قوت ہے۔اس لیے محبت نمایاں حوالوں کے باوجود قائم کا غم زمانہ اس کے غم محبت سے زیادہ وسیع اور تہ دار نظر آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ قائم کے یہاں زمانے کی شکایت میں زیادہ تاثیر ہے۔ان کی شاعری کا یہی وہ پہلو ہے جس میں یاس کی خلش کہیں زیادہ ہے۔ان کی افسردگی، رنج والم، احساس شکست و نارسائی، تنہائی یہ سب کیفیات زمانے کی ناقدر دانی اور حوادث کی کارفرمائی کے حوالے سے بہت بھرپور نظر آتی ہیں:

میں دوانہ ہوں سدا کا مجھے مت قید کرو
کبھو ہمیں بھی کہہ آتا تھا درد دل اس سے
قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
قائم نہیں یہ سختی دوراں دور روز بیش
کا ہے کو رکھیے زمانے سے تمتع کی امید
مانند نفس آپ سے جاتا ہوں میں ہر دم
نہ پوچھو کیونکہ میری ان دنوں اوقات کٹتی ہے
جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ
پر اس طرح کہ شکایت میں کچھ زمانے کی
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا
کرتا ہے کیوں گلہ تو غم روزگار سے
بخت دیتا نہیں جس کو یہ ہنر دیتا ہے
اک عمر سے لاحق ہے سفر مجھ کو وطن میں
کہ دن گر روکے گزرے ہے تو مر کر رات کٹتی ہے

قائم کی تمام تر خصوصیات کے اعتراف کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ کار نہیں کہ قائم کے یہاں کسی بڑے المیہ تجربے کی رونمائی نہیں ہوئی۔وہ اپنے غم کی کوئی فلسفیانہ یا مابعد الطبیعیاتی توجیہ بھی پیش نہیں کرتے۔وہ کہیں بھی غم کو زندگی یا کائنات کی اساس قرار نہیں دیتے۔ہاں اپنا غم ضرور اثر انگیز طریقے سے بیان کرتے ہیں لیکن کسی فلسفیانہ فکر کے نہ ہونے کے باوجود ان کے پاس یاس والم اور جذبات و کیفیات غم کو بیان کرنے کے کچھ ایسے فنی حربے اور وسائل موجود ہیں جو اپنے پورے لوازمات کے

میں ابھرتے ہیں۔

ساتھ صرف میر تقی میر کی شاعری ... ایک ایسا شاعر ...
قائم چاند پوری کو ایک اہم ... غم کے مضمون ...
کی جمالیاتی تشکیل پر ... کم از کم ... اس خاص فنی ...
بیان کر سکے، غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔...
میر اور مصحفی کے درمیان کی کڑی معلوم ہوتے ہیں ...
مقابلے میں خارجیت کا رنگ زیادہ ... محاکات ...
لیکن مصورانہ صلاحیت کے اعتبار سے قائم چاند پوری بھی خاص ...
اور میر کے مقابلے میں شوخ رنگوں کے استعمال میں غیر معمولی ...
ہیں۔غم کے مضامین کو بیان کرنے میں تصویریت ...
شاعری کے حزنیہ آہنگ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔...

چھوڑ تنہا مجھے ... رب ... انھیں ...
کس جگہ ڈھونڈے قائم تجھے اے خانہ خراب
شہر معمور دل اس طرح ہوا آہ خراب
ہم اسیروں کو نہ ... تکلیف گلگشت اے نسیم
سمجھ کے بشیشہ دل کو لگیو اے بت مست
یک عمر رہے ... جوں حباب ...
غم جنہیں آٹھ پہر تھا مری تنہائی کا
جانیے کون سے جنگل کو تو آباد کیا
نام گویا کہ نہ تھا یاں کبھی آبادی کا
کون سی باقی ہے دل میں اب ہوائے سیر باغ
بجائے بادہ لہو ہے اس آبگینے میں
ہم کو بھی کبھو خواہش گل پیرہنی تھی

قائم چاند پوری کی شاعری کا حزنیہ عنصر جیسا کچھ ہے صداقت ...
حیات سے مربوط ہے۔یہ اور بات ہے کہ حقائق حیات ان کے یہاں ...
میں چہرہ نمائی نہیں کرتے۔قائم کے یہاں صناعی ہے تفکر نہیں ...
زبان و بیان پر دسترس ہے مگر مطالب میں وسعت اور ندرت نہیں۔...
اردو کی حزنیہ شاعری میں وہ المیہ احساس اور المیہ جذبے کی جمالیاتی تشکیل ...
سے ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے والد غلام حسن منٹو قوم اور ذات کے کشمیری ...
وکیلاں میں ایک بڑے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔
منٹو 11 مئی 1912 کو موضع سمبرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے ...
کسی تحصیل میں تعینات تھے ... انہیں ... کے نام سے ...
میں ایک سہما ہوا بچہ تھا۔جو سوتیلے بہن بھائیوں کی موجودگی اور والد ...
آپ ظاہر نہ کر سکتا تھا۔

اردو اسکا

International Peer Reviewed& Refereed Journal For Urdu

2320-8910, ISSN: 2320-5369

OLARS KI DUNIYA-IRJU

OS IMPACT FACTOR: 3.527

al Impact Factor: 0.383

Factor-Berlin Brandenburg, Germany

obal Series Directory, USA

earch Journals Indexing, India

lia

ational Research Library)

estasse-Diepoldsau- Switzerland

S • Malegaon • MAHARASHTRA • INDIA

Urdu Sahitya Academy Award 20 5
(Maharashtra State)

JOURNAL INDEXED IN

GIF GLOBAL IMPACT FACTOR

Scientific Indexing Services

COSMOS IMPACT FACTOR

calaméo

Yumpu

WorldCat

slideshare

شجاع خاور: شخص اور شاعر

ڈاکٹر منور حسین

شعبہ اردو، فیکلٹی آف آرٹس و ہیومنٹیز، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ، اتر پردیش۔ انڈیا

مختصر تعارف:

شجاع الدین ساجد ملقب بہ شجاع خاور کی ولادت قصبہ شہر کے محلہ رودگراں (لال کنواں) میں ۲۴ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔ ان کے والد امیر حسن نہایت نیک سیرت اور سادہ لوح انسان تھے۔ شجاع خاور نے ابتدائی تعلیم ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۳ء تک فراش خانہ کے مظہر الاسلام اسکول میں پہلی سے آٹھویں جماعت تک حاصل کی۔ اس کے بعد اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ دہلی اور دلی کالج (دہلی یونیورسٹی) سے فارسی، اردو اور انگریزی میں بی اے آنرز اور انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۲ء میں ایک سال کے لیے میو کالج نوح (گڑگاؤں) میں انگریزی پڑھائی اور پھر ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۴ء تک دلی کالج میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہو گئے لیکن اسی دوران وہ آئی پی ایس کا امتحان پاس کر کے دہلی پولیس کے افسر بن گئے۔ محکمہ پولیس میں وہ شجاع الدین ساجد اور شاعری میں شجاع خاور کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ شروع ہی سے ذہین اور زندہ دل انسان تھے۔ انگریزی، فارسی اور اردو ادب کے مطالعے نے انھیں طالب علمی ہی کے زمانے میں غیر معمولی لیاقت و صلاحیت کا حامل بنا دیا تھا۔

شجاع خاور نے ۱۹۶۴ء سے اپنی شعر گوئی کا آغاز کیا تھا۔ وہ اپنے ادبی اور تخلیقی سفر کا ذکر اپنے مجموعہ کلام "الله ہو" میں اس طرح کرتے ہیں:

"نوعمری سے ہی شاعری میری شخصیت کا حصہ بننا شروع ہو گئی تھی کیوں کہ میرا شعری سفر ۱۹۶۴ء سے شروع ہو گیا تھا چنانچہ طالب علمی کے زمانہ میں ہی میں نے تاج محل پر اردو میں لکھی گئی نظموں کو منتخب کیا۔ ان پر اپنے تبصرے لکھے اور اپنی پہلی کتاب "اردو شاعری میں تاج محل" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع کرائی۔ اس مجموعہ میں میری اپنی نظم بھی شامل تھی۔ ۱۹۷۰ء میں میری طویل نظم "دوسرا شجر" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ طویل نظم جو ۶۰۰ مصرعوں پر مشتمل تھی اور اشاعت سے دو سال پہلے یعنی ۱۹۶۸ء میں تخلیق ہو گئی تھی۔ یہ نظم تخیل کے عمل سے گزرتے ہوئے شاعر کے ان ذہنی سوالات پر مشتمل تھی جو کائنات، انسان، وقت اور خدا کے بارے میں مجھے پریشان کرتے رہتے تھے۔ زندگی کی ابتدا اور نوجوانی کا عرصہ ادب کی وادیوں میں گزرتا رہا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کالجوں میں انگریزی ادب کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور تقریباً دو برس بعد باقاعدہ سرکاری ملازمت میں شامل ہوا۔ ملازمت نے میری شخصیت کو ایک دوسری طرح کی شناخت کا نمونہ بنا دیا۔ حالاں کہ میری بنیادی اور اصلی شناخت ایک آزاد خیال تخلیق کار یا شاعر ہی کی تھی"۔ اس طرح انھوں نے اپنے تخلیقی اور ادبی سفر کا آغاز کیا۔

ان کی تصنیفات و تالیفات میں "اردو شاعری میں تاج محل" (مرتبہ) ۱۹۶۸ء، "دوسرا شجر" ۱۹۷۰ء، "وادین" (شعری مجموعہ) ۱۹۸۲ء، "مصرع ثانی" (غزلیات) ۱۹۸۷ء، "غزل پارے" (منتخب اشعار) ۱۹۹۰ء، "بات" (غزل دیوناگری رسم الخط میں) ۱۹۸۷ء، "رشک فارسی" (مجموعہ غزلیات) ۱۹۹۳ء، "الله ہو" (شعری مجموعہ) ۲۰۰۰ء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۵ جنوری ۲۰۱۲ء کو دل کا زبردست دورہ پڑا جس کے سبب ان کو ہسپتال میں داخل کرایا گیا اور ۱۹، ۲۰ جنوری ۲۰۱۲ء کی درمیانی شب دل کی بیماری نے

ہے ان کی آوازوں میں گونج رہی ہے

آخر کو موت مگر ... بچے کے ... رخصت ہونے کے بعد ...

مجھ کو تو مرنا ہے اک دن یہ مگر زندہ رہے
کاروبار کی موت کا کیا ہے یہ زندہ رہے

اپنے اپنے گھر چلے ہیں
ہم سے اک دن مر چکے ہیں

شجاع موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا بہت ضروری ہے

شجاع خاور کی شخصیت اور شاعری پر دانشوروں کے تاثرات

آزادی کے بعد جو پچاس برسوں میں جن شاعروں نے بڑی کامیاب نمائندگی کی ہے ان میں شجاع خاور کا نام بھی خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ جو بہت سے شاعروں کے لیے کیے جاتے ہیں انھوں نے شاعری کو ایک الگ ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ ان کی شاعری اور شخصیت میں جن اقدار کا رچاؤ بسا تھا وہ انھیں ایک منفرد شاعر بناتی ہے۔ قرۃ العین حیدر، آل احمد سرور، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر محمد حسن، انصاری، خلیق انجم، علی احمد فاطمی، ابن کنول، مظہر امام وغیرہ جیسے ممتاز ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں نے شجاع خاور کی شاعری کا اعتراف کیا ہے اور ان کے شعری خصوصیات، اسلوب بیان، مضمون آفرینی، فن غزل گوئی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں سے بعض مشہور ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کے آرا و تاثرات کو یہاں پر پیش کرنا ضروری ہے جس سے ان کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آل احمد سرور کے نزدیک "شجاع خاور کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت کیا ہے" میرے نزدیک یہ Wit یا ذہانت ہے اپنے دیوان کے ذریعے سے انھوں نے بحیثیت ایک منفرد رنگ کے زندگی کا مشاہدہ کیا مگر اس منفرد رنگ میں ایک قلندرانہ شان ہے۔"

قرۃ العین حیدر کا خیال ہے کہ "شجاع خاور کا کمال یہ ہے کہ ان کے کتنے ہی اشعار حوالے کے طور پر Quote (نقل) کیے جا سکتے ہیں۔۔۔ ان کے اشعار میں چٹپٹا پن اور سپاٹ پن نہیں ہوتا۔ ان میں فکر، برجستگی اور ذات بیانی کے عناصر بیک وقت ملتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔"

... انصاری شجاع خاور کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "شجاع خاور نے شعر میں گفتگو اور عام سے محاورے میں فلسفے کا جو رنگ ملا دیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اب تک کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔۔۔ ان کے بزرگوں اور معاصرین میں کسی نے یہ باتیں اس ڈھب سے نہیں کہی تھیں"

پروفیسر محمد حسن شجاع خاور کی شاعری کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "غزل میں سہل ممتنع کی شاعری کو اعلیٰ ترین سطح کی شاعری سمجھا جاتا ہے اور سہل ممتنع کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ اس کی نثر نہ ہو سکے اور شعر میں نثر کا سا دروبست قائم رہے۔ یہ خصوصیت شجاع خاور کے کلام میں موجود ہے"

ڈاکٹر خلیق انجم ان کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتے ہیں "ان کی شاعری کے بارے میں میرا خیال ہے کہ دلی کی زبان پر اتنی قدرت شاید کسی کو حاصل نہ ہو۔ شجاع خاور کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی زندگی سے انھیں غیر معمولی لگن تھی۔ گو وہ انگریزی کے لکچرر بھی رہے لیکن وہ اپنے ماحول کو بڑی گہرائی سے سمجھتے تھے اور پھر اس کو شاعری میں منتقل کرتے تھے"۔

پروفیسر علی احمد فاطمی ان کی شاعری کے بارے میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں "ان کی شاعری میں ایک عجیب قسم کا نوکیلا پن اور ساتھ بانکا پن بھی تھا۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ ان کی غزل میں کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن اس کے بطن میں اتریے تو ایک جہان معنی آبشار کی طرح ابلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

موجودہ دور کے مشہور شاعر وسیم بریلوی ان کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں: "اردو شاعری کا نیا منظر نامہ، پیچیدہ ادبی محاذ سے سمجھنے میں متفاوت سے لگیں مگر اس میں شک نہیں کہ شجاع خاور جیسے فکری ہمواری توڑنے والے اور روایتی زمینوں والی ذہنی آلودگی سے بروش آہوں سے بچ نکلنے والے روز روز پیدا نہیں ہوتے۔"

پروفیسر اختر الواسع ان کے فنی کمالات کے بارے میں کہتے ہیں: "شجاع خاور کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے ایک طرف جہاں فنی کمالات پر نظر رکھی وہیں انھوں نے بے تکلف شعر کہنے کی روایت کو بھی برقرار رکھا۔"

پروفیسر ابن کنول شجاع خاور کو بیسویں صدی کے نصف آخر کا ایک نمایاں شاعر تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "شجاع خاور نے بیسویں صدی کی آٹھویں اور نویں دہائی میں اپنے منفرد لہجے اور شاعرانہ بانکپن سے دہلی اور اردو شاعری میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ دہلی کے لب و لہجے اور مخصوص ٹکسالی زبان پر شجاع خاور کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے معاصر شعرا میں اپنی علاحدہ شناخت قائم کر لی تھی"۔

غزل میں روایتی طور طریقے، لفظیات، اسالیب اور رنگ و آہنگ کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ بعض شعرا نے ان سے اخذ و اکتساب کیا اور بعض نے ان کو رد ہے لیکن چند ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی الگ راہ نکالی اور چند نے تو انھیں راہ پر چلنا مفید سمجھا اور ان کی پیروی کی ہے۔ روایتی اور کلاسیکی شاعری سے اپنی ذہنی و جذباتی وابستگی کے باوجود شجاع خاور کی شاعری میں بغیر سوچے سمجھے، اندھی تقلید اور بے جا پیروی کا پہلو نظر نہیں آتا۔ شجاع خاور کی اسی خوبی اور منفرد لب و لہجہ کی تعریف معتبر نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ اس انداز میں کرتے ہیں:

"روایتی غزل میں تو سب خیریت ہی خیریت ہے اس انبوہ میں تو ہو چاہے جب کہ کاوش شریک ہو سکتا ہے لیکن نئی غزل میں بار پانا اور اپنی آواز الگ سے پہچانا جانا اتنا ہی مشکل ہے۔ شجاع اپنے اطراف کی غزل اور اس کی بندھی ٹکی لفظیات سے شدید طور پر نا آسودہ ہیں۔ کوئی بھی شاعر انحراف کی راہ پر تبھی نکلتا ہے جب وہ موجود اور مانوس سے سخت نا مطمئن ہو یا کسی داخلی اضطراب سے دوچار ہو یا طرفگی اور تازگی کی جمالیات مرتب کرنے کے لیے سب کچھ داؤں پر لگانے کو تیار ہو۔ شجاع خاور نے بغاوت کی راہ اتفاقاً نہیں ارادتاً اختیار کی ہے۔ لفظ جب تخلیق کی تپش سے گرماتا ہے تو معنی لو دینے لگتا ہے۔ شجاع خاور نے بنی بنائی پٹری پر چلنے سے انکار کیا ہے اس لیے لفظیات وضع کرنا بھی ضروری تھا تاکہ عامیانہ تصورات کو چیلنج کیا جا سکے۔ غزل کی روایتی لفظیات پر اشرافیہ کے رکھ رکھاؤ کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ شجاع خاور نے پہلا کام یہ کیا کہ رسمیات کے رنگین پردوں کو الگ کر دیا، جہاں رسمیات اور مرصع کاری ہوگی وہاں بورژوائیت بھی ہوگی۔ شجاع کا تخلیقی رویہ بنیادی طور پر اسی منقوطی بورژوائیت سے گریز کا ہے۔ بورژوائیت دراصل پابستگی رسم و رہ عام کا دوسرا نام ہے اس لیے محفوظ ترین راہ عمل یہی ہے۔ اس کے برعکس انحراف خطرات مول لینے کا کھیل ہے۔ شجاع رسمیات اور فرسودگی اسالیب کے تئیں چونکہ بے حد حساس ہیں چنانچہ ان کے لیے اپنی انفرادیت کو منوانا اور ہر طرح کے Doxa کو رد کرنا بے حد ضروری تھا۔"

شجاع خاور کی شاعری آج کے انسانی مسائل کی عکاسی کرتی ہے اس میں ایک الگ طرح کی برجستگی ہے جو انھیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ایک بڑی خوبصورتی دلی کی اس ٹکسالی زبان کا استعمال ہے جو ان کے شعروں میں دو آتشہ کا مزہ دیتی ہے۔ شجاع خاور کے کلام کی بے ساختگی، بے باکی، فکری گہرائی اور خاص ٹکسالی لب و لہجہ نہ صرف اردو غزل کے انوکھے تیور اور نئے مزاج کو ظاہر کرتا ہے بلکہ تصنع اور بناوٹ سے پاک سچی بات صاف صاف کہنے کا ڈھنگ انداز اور قلندرانہ مستی غزل کے ہزار رنگوں میں ایک بالکل نئے رنگ کا اعلان بھی ہے۔ لگی لپٹی کے بجائے صاف لفظوں میں کہا جائے تو داغ کے بعد دلی اسکول نے کوئی ایسا بڑا شاعر پیدا نہیں کیا جسے شجاع خاور کے مماثل دیکھا جا سکے بقول ڈاکٹر خلیق انجم:

"دلی اور لکھنؤ اردو زبان کے اہم مراکز رہے ہیں ان دونوں مقامات سے صف اول کے ایسے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جو تاریخ ادب اردو کا روشن ترین باب ہے لیکن ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ان دونوں شہروں میں صف اول کے فن کار پیدا ہونا بند ہو گئے۔ بیسویں صدی کے تمام بڑے شاعر دلی اور لکھنؤ سے باہر پیدا ہوئے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے صرف علامہ اقبال، جوش، فراق، جگر، اصغر، حسرت، ساغر نظامی، فیض، روش صدیقی، سردار

ISSN 2320-5369, EISSN 2320-8910
IF: Global Impact Factor: 0.383

عصری بیان نگار اختر وغیرہ کے نام مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ دلی میں ساحل اور نکھرو پیدا ہوئے۔ زبان محاورہ اور روزمرہ کا استعمال جیسے
شاعروں کا مطالعہ ضروری ہے لیکن یہ دونوں اپنے عہد کے ممتاز شاعر تو ہیں بڑے شاعر نہیں ہیں۔ بہت طویل عرصہ بعد سرزمین دلی سے ایک بڑا شاعر
شجاع خاور۔ شجاع خاور کو دلی کی زبان پر وہ قدرت حاصل ہے جو "داغ اسکول" کے اساتذہ کو تھی لیکن وہ شیخ میر سے ہی جا نے کی خوشنودی کر دی
شاعری نہیں کرتے۔ اپنے گرد پھیلی ہوئی زندگی پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ عصری زندگی کے مسائل اور خاص طور سے زندگی کے تضادات کو بے تکلفی
اور کبھی کبھی غیر سنجیدگی سے بیان کرتے ہیں لیکن اس غیر سنجیدگی پر ہزار سنجیدگی قربان"۔

شجاع خاور کی غزل گوئی کی خصوصیت کو ظ۔ انصاری کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

"شجاع خاور کو اردو کا سکی سرمائے پر خوب عبور ہے۔ وہ اگلوں کے لہجے میں بات کرنے کو نہ نقالی سمجھتا ہے نہ وہ اس سے شرماتا ہے۔ وہ
رنگ سخن سے اور ٹھوس بات کو ٹھوس لفظوں میں کہنے سے نہ جھجکتا ہے نہ اس کو اپنی شناخت بناتا ہے۔ نہ وہ نثری جملوں کی موزونیت کو شعر سے کاٹ کر
لفظوں کی ذات برادری پوچھتا ہے۔ قدرت کلام اور فنی مشاقی اس کلام کی مقدار سے نہیں اس صفت سے ظاہر ہوتی ہے"۔

شجاع خاور کی شاعری

بیسویں صدی کے نصف آخر کے ان باکمال شاعروں میں شجاع خاور کا شمار ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ہم عصر شاعروں سے ہٹ کر اور منفرد
لہجہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے غزل کی فکری و معنوی پس منظر کو وسعت عطا کی ہے اور اگر زبان کی سطح دیکھا جائے تو انھوں نے غزل کو نیا پن بھی دیا
غزلوں میں کلاسیکی شاعری بھی موجود ہے اور قدیم شاعروں کا آہنگ بھی پایا جاتا ہے۔ شجاع خاور کی شاعری نے انگریزی کے بہترین شاعروں کا
مطالعہ۔ ان کے کلام میں غالب اور ذوق کا رنگ بھی تھا اور دلی کی گلیوں میں تیرتی ہوئی ماضی کی فضاؤں کی روایتی شوخی اور زندہ دلی بھی۔ نئے فکری رجحا
نکار شجاع نے اپنی سوچ کو قدیم تہذیبی عمارتوں کے کھنڈرات میں پرواز کا ہنر بخشا ہے:

چارپائی تو استعارہ ہے
زخم بھر آ گیا ہے بان تلک
گیا وحشت کو سارا شہر
دیوانہ بیچارا جا رہا ہے

اسی طرح انھوں نے بہت سے قدیم مضامین کو نئے آہنگ میں پیش کر کے اپنی لسانی ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے:

کر دیا حیران اک تصویر نے
ایسے پگھلے ہم کہ پتھر ہو گئے

میر کی ایسی غزل کوئی بھی کیا
سننے والے گھر سے بے گھر ہو گئے

مبارک ساعت تجدید زخموں کو مبارک ہو
میرے گھر پہ کوئی غمخوار ہمدردانہ آتا ہے

گریباں چاک اور دامن کے چاک کرنے کا موضوع ہو صحرا نوردی، وحشت، چپالی وغیرہ جیسے موضوع ہماری غزل کا حصہ رہے ہیں لیکن ا

شجاع خاور نے نئے پیرائے اور نئے انداز میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بچا ہوں میں ایک نیا زاویہ کرو
وحشت بڑھے تو چاک گریباں سے کرو
یا اس بہار پہ بھی کرو وحشتوں کے وار
یا پھر کہیں پہ چاک گریباں رفو کرو
شجاع میں یہ عشق بھلا کہاں کا ہوا
نہ آہ بھری نہ زخم جگر دکھائے گئے
ساری دنیا کر رہی ہے اس کی صحرا میں تلاش
اور دیوانہ چھپا ہے میرؔ کے دیوان میں

ہوش والے دشت کی جانب گئے تھے ایک دن
تب سے دیوانہ غائب دشت سے مفرور ہے

اگر آپ اردو ادب کا مطالعہ کریں گے تو نظر آئے گا کہ میرؔ سے لے کر ندا فاضلی کے اشعار تک یادوں کا ایک طویل سفر ہے لیکن یہ موضوع شجاعؔ خاور کی غزل میں جب بھی آیا نئے انداز سے آیا ہے:

رشتے بنائے ہم نے بھی کیسے نئے نئے
کیا کیا قدم اٹھائے تیری یاد کے خلاف

دل برباد سے یوں مت نکالو اس کی یادوں کو
میاں آساں نہیں ایسے مکینوں کو کہیں ملنا

ایسا نہیں ہے کہ شجاعؔ خاور کی شاعری میں روایت کی پاسداری کا اہتمام نہیں ہے ان کے یہاں روایت کی پاسداری کا اہتمام احتیاط کے ساتھ ملتا ہے بلکہ ان شاعری میں روایت اور کلاسیکیت کا صحت مندانہ اظہار ملتا ہے جس کو ان کی شاعری میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

دوائی چارہ گر نے دی بھی تو ہم مر نہیں پائے
مگر تیرے نہ آنے نے یہ دشواری بھی حل کر دی

اندر سے جو بھی حال ہو گھر کا ہوا کرے
باہر سے آرزو کا دریچہ سجا کے رکھ

یہ تنگ خیالی کی باتیں ہیں میاں چھوڑو
ایک اس کا ہی کوچہ کیا سارا جہاں چھوڑو

سکے تجھ کو کیسا لگ رہا ہے
ہمیں تو زخم اچھا لگ رہا ہے

شجاع خاور کی شاعری کی ایک خصوصیت قلندرانہ صفت ہے قرۃ العین حیدر نے صحیح کہا ہے کہ "شجاع خاور کی شاعری میں قلندروں کی سی گونج سنائی دیتی ہے" اور صوفیانہ مزاج بھی ان کی غزل شاعری کا ایک اہم عنصر رہا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کسی کا راز، کسی کی زباں، کسی کے گوش
ہمیں پتا نہیں عرفان ذات کا قصہ
ہم صوفیوں کو دونوں طرف سے زیاں ہوا
عرفان ذات بھی نہ ہوا رات بھی گئی
ذرا سا وقت گزارا تو آسمان کے ساتھ
گئی اک عمر زمیں کو حساب دینے میں
اپنے ہی جیسے زمیں لوگ ہیں
آسماں سے ہے یہاں بہتر گزر

شجاع نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہی ہیں خاص طور پر "دوسرا شجر" جیسی طویل نظم کو پڑھئے تو کہیں "شکوہ جواب شکوہ" کی گونج سنائی دیتی ہے اور کہیں علی سردار جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" کی کیفیت بھی۔ روایت اور جدیدیت کے ساتھ ان کی اپنی مخصوص تخلیقیت نے ان کی شاعری کو دو آتشہ ہی نہیں بلکہ سہ آتشہ بنا دیا۔ ان کی نظموں کا تعلق ان کی شاعری کے ابتدائی دور سے رہا ہے۔ جب وہ لیلائے غزل کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تو پھر ان کی توجہ نظم کی طرف نہ رہی۔ ان کی نظموں میں تجربے اور طریقۂ اظہار دونوں میں نیا پن نظر آتا ہے۔ تاریخ ادب میں ایک نظم گو کی حیثیت سے شجاع خاور کا نام محفوظ رکھنے کے لیے ان کی طویل نظم "دوسرا شجر" کافی ہے۔ یہ نظم ۲۲۶ مصرعوں پر مشتمل ہے جس میں نظم کی تینوں ہیئتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ نظم دراصل انسان کی بیچارگی کی داستان بھی کہی جا سکتی ہے کیوں کہ نظم جن بنیادوں پر قائم ہے اور خدا سے جس طرح کلام کیا جا رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ محرومی محرومی ہے۔ نظم میں آدم اور خالق کائنات کا مکالمہ فنی قدر و قیمت کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

کتابیات

۱۔ "محسن علی" "شجاع خاور، ۱۹۸۷ء۔
۲۔ میں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں، گوپی چند نارنگ، مشمولہ سہ ماہی ادب ساز دہلی، جنوری تا مارچ، 2015ء۔
۳۔ دوسرا شجر، شجاع خاور، ادارہ پبلیشرز اردو بازار دہلی، بار اول ۱۹۷۰ء۔
۴۔ غزلیں (دوسو منتخب اشعار) شجاع خاور، غزل آباد کلچرل سوسائٹی، دہلی۔
۵۔ شجاع خاور: خراج دوستاں پیشکش اے۔ رحمان، ماہی اردو ادب دہلی۔

☆☆☆